(غلام گردش)

اسلاموفوبیا بڑھ سکتا ہے؟

اسلام کے خلاف منفی جذبات، یعنی Islamophobia جیسے الفاظ اس وقت ہر جگہ، ہر سطح پر بے دریغ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ہمارے جیسے نیم خواندہ ممالک کے سیاستدان، تاریخی تناظر کے بغیر، سوچ سمجھ سے عاری، اس انتہائی مشکل لفظ کو اپنی گفتگو کا باقاعدہ حصہ بنا چکے ہیں۔ کوئی غیر ملکی گورا رہنما یا لیڈر قابو آ جائے، تو الفاظ کی یہ ترکیب ضرور برتی جاتی ہے۔ سیاستدانوں کے علاوہ ہمارے مذہبی دانشوروں کے گروہ در گروہ ہیں جنہیں دنیا کے ہر خطے میں ہمارے عظیم مذہب کے خلاف سازش نظر آتی ہے۔ کوئی بھی شخص، بالالخصوص لکھاری یا دانشور، خوف کی بدولت ان لوگوں کے متعلق کوئی منفی بات نہیں کرتا۔ بالخصوص جس ملک میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس میں ہر حکومت، ہمارے مقامی مذہبی حلقوں سے ڈر کر کوئی بات نہیں کرتی۔ مگر سماج میں خوفزدہ ہو کر ایک خاص ڈھب سے سوچنا اور لکھنا ناممکن ہے۔ کوئی بھی ایسی متعصب تلوار نہیں جو آپکو سوچنے کے عمل سے منقطع کر دے۔ بہر حال مغرب میں موجود، اسلام کے خلاف منفی جذبات پر بات کرنا وقت کا اہم ترین تقاضہ بھی ہے اور ایک فرض بھی ہے، شائد قرض بھی۔

1918 میں ایک فرانسیسی مصور الفانسو ڈینٹ اور ایک الجیرین مسلمان دانشور، سلمان بن ابراہیم نے یہ لفظ یعنی Islamopobia اپنی تصانیف میں پہلی بار استعمال کیا۔ آپ حیران رہ جائینگے کہ اسلام کے خلاف منفی رجہانات، ان دانشوروں نے غیر مسلموں سے نتھی نہیں کیے۔ بلکہ یہ کہا کہ اس عظیم مذہب کو دراصل، لبرل اور خواتین کے حقوق پر بے دریغ لکھنے والے، مسلمانوں سے خطرہ ہے۔ یہ بات، مجھے بھی اَز حد عجیب لگی کہ اسلاموفوبیا میں غیر مسلموں کا کہیں گمان اور بیان تک نہیں تھا۔ اگر آج کے معاملات دیکھے جائیں تو یہ بالکل متضاد بات نظر آتی ہے۔ بہر حال اس علمی بحث کو ایک کالم میں سمیٹنا ناممکن ہے۔ خیال ہے کہ اسکی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اہم بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے عقائد اور انکے خلاف امتیازی سلوک پر سب سے زیادہ علمی اور فکری کام بھی مغرب میں ہوا ہے۔ متعدد رپورٹس میں فرنگی اور کافر اداروں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مغربی ممالک میں مسلمانوں کو اپنے دینی عقائد کی بدولت حد درجہ نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ 1996 میں رنی میڈ ٹرسٹ نے برطانوی مسلمانوں اور اسلاموفوبیا پر ایک کمیشن بنایا۔ اسکی سربراہی سیکسیس Sussex یونیورسٹی کے وائس چانسلر Gordon Conway کر رہا تھا۔ کمیشن کی رپورٹ 1997، برطانیہ کے ہوم سیکرٹری جیک سٹرا نے شائع کی۔ اس میں سرکاری سطح پر پہلی بار تسلیم کیا گیا کہ مسلمانوں کو ہر جگہ اپنے عقائد کی بدولت توہین کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انکی تضحیک کی جاتی ہے۔ اس رپورٹ میں یہاں تک لکھا گیا کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے اور اسکے متعلق منفی پروپیگنڈا بے بنیاد ہے۔ آپ نے کبھی بھی اس رپورٹ کا ذکر نہیں سنا ہوگا۔ اسکا سرکاری نام Runnymede Report ہے۔ پاکستانی سرکار سے درخواست ہے کہ اسکو ملک کی تمام درسگاہوں اور لائبریریوں میں رکھوایا جائے تا کہ اسلام وفوبیا کے محرکات اور معاملات کو سنجیدگی سے سمجھا جا سکے۔

2001 میں 9/11 کے ہولناک واقعہ کے بعد ہر چیز تبدیل ہوگئی۔امریکی صدر جارج بش نے ایک انتہائی ادنیٰ بات کی کہ امریکہ صلیبی جنگوں کے دورانیہ میں داخل ہو چکا ہے۔وجہ صرف یہ تھی کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو تباہ کرنے والے تمام لوگ مسلمان تھے اور اکثریت کا تعلق سعودی عرب سے تھا۔بعدازاں، مغربی ممالک میں ہر جگہ مسلمان شہریوں کو نفرت، تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔عالمی جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔پاکستان کے خلاف ایک انتہائی سوچی سمجھی عالمی تحریک شروع کی گئی اور ہمیں عالمی دہشت گردی کا مرکز قرار دیا گیا۔''صحیح یا غلط'' یہ تاثر آج بھی کسی نہ کسی طور پر قائم ہے۔اُسامہ بن لادن کے ہمارے ملک میں قیام پذیر اور اس پر امریکی حملے نے تمام تر مسائل، ہماری ٹوکری میں ڈال دیے۔آپ مانیں یا نہ مانیں، ہمارے دشمن ممالک نے اس واقعہ کا اتنا فائدہ اُٹھایا، جسکا اندازہ تک نہیں لگایا جاسکتا۔اس وقت سے لیکر آج تک عالمی صف بندی میں ہمارے حلیف، ہمارے مخالف بن چکے ہیں۔ہندوستان، امریکہ اور دنیا کے طاقتور ملکوں کا ساتھی بن گیا اور عملی طور پر ہم تنہا رہ گئے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اس عالمی تنہائی کو ہماری کوئی بھی حکومت ختم تو کیا، کم تک نہیں کرسکی۔بہرحال، اسلاموفوبیا پوری مغربی دنیا میں جڑ پکڑ گیا۔کینیڈا اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک نے اسکی مخالفت ضرور کی، مگر اسے کم نہیں کر پائے۔مگر اب میں اس ساری صورتحال کے ایک انتہائی متضاد پہلو کی طرف آتا ہوں۔جس پر کم از کم ہمارے ملک میں کبھی بات نہیں ہوئی۔بلکہ اس موضوع پر بات کرنا اَزحد مشکل بنا دیا گیا ہے۔وہ ہے کہ ہمارے تارکین وطن کا مغربی ممالک میں سماجی رویہ کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جسکا جواب تلاش کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔میری نظر سے کوئی ایسی مستند رپورٹ نہیں گزری، جسکا سہارا لیکر میں مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کے مقامی ممالک پر رویوں کی بات کرسکوں۔پاکستانی حکومت کی شائع کردہ کئی ایسے دستاویزات ہیں، جو اسلاموفوبیا پر تو بات کرتی ہیں، مگر ہمارے سماجی، لسانی، مذہبی رویوں کے متعلق بات کرنا شائد انکے بس کی بات نہیں ہے۔صرف مغربی ملکوں کے حوالے سے گزارشات کر رہا ہوں۔

نکتہ اَزحد نازک اور توجہ طلب ہے۔اکثر ملک سے باہر جاتا رہتا ہوں۔دنیا کے تمام برِاعظموں میں جا چکا ہوں۔سب سے زیادہ امریکہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔پورے یورپ میں مسلمان تقریباً ہر ملک میں موجود ہیں۔ایک فیصد سے لیکر آٹھ فیصد تک۔برطانیہ میں اگر جانے کا اتفاق ہو تو آپکو مسلمان ہر جگہ نظر آئینگے۔امریکہ میں بھی یہی حال ہے۔مگر گراں بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثریت مقامی گورے لوگوں سے میل جول اَزحد کم رکھتے ہیں۔انکی خوشی غمی میں شمولیت بھی اَزحد کم ہے۔مقامی تقریبات میں شراکت بھی کافی کم درجہ کی ہے۔شائد آپکو یقین نہ آئے۔مگر یہ اَمر دیکھ چکا ہوں کہ جہاں مسلمان گھر بناتے ہیں یا کرایہ پر لیتے ہیں۔تھوڑے عرصے کے بعد، مغربی لوگ وہاں سے کسی اور بستی میں منتقل ہو جانا بہتر سمجھتے ہیں۔بہت سی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ ہماری سماجی علیحدگی ہے۔ایک حقیقت پر مبنی گزارش کروں۔آسٹریلیا جانے کا اتفاق ہوا۔چار سال پہلے کی بات ہے۔ایک انتہائی اخلاص والے پاکستانی تاجر نے دعوت کا انتظام کیا۔وہاں بیس پچیس پاکستانی بھی تشریف لائے۔گفتگو کے دوران ایک نوجوان نے بتایا کہ نو برس سے ایک بین الاقوامی شہر میں ٹیکسی چلاتا ہے۔میری نظر میں یہ قابل قدر بات ہے۔مگر اس نوجوان کا دوسرا فقرہ چونکا دینے والا تھا۔''میں نے آج تک کُرتے شلوار کے علاوہ کوئی اور لباس نہیں پہنا۔آج تک پینٹ کوٹ نہیں پہنا''۔جب میں نے پوچھا کہ کیوں، تو موصوف نے بات بدل لی اور کوئی اور موضوع

چھیڑ دیا۔خود سوچیے ۔اگر سڈنی میں جا کر،آپ وہاں کے مقامی لباس کو پہننا پسند نہیں کرتے ،تو لوکل آبادی آپکے متعلق کیا سوچے گی؟ مطلب تو سادہ سا ہے کہ آپ مغربی ممالک میں انہی شرائط پر رہنا چاہتے ہیں جو پاکستان کے شہروں اور دیہاتوں میں مروجہ ہے۔ بڑی سادہ سی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے ننانوے فیصد لوگ ،مغرب میں رہتے ہیں مگر وہاں کی مغربی تہذیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔لندن چلے جایئے۔ساؤتھ ہال کے علاقے میں تشریف لے جایئے۔سری پائے ،نہاری،حریصہ اور تمام پاکستانی کھانوں کی دکانیں نظر آئینگی۔فٹ پاتھ پر مرد اور خواتین،خوانچے لگا کر بیٹھے ہونگے۔مختلف مقامات پر دیواروں پر ہر طرح کے جملے، لکھے نظر آئینگے۔انڈین اور پاکستانی ہر طرف گامزن ہونگیں۔مگر ایک چیز ضرور محسوس کرینگے۔وہاں گورے لوگ بہت کم رہتے ہیں۔مقامی آبادی اکثریت تعداد میں لندن کے ان علاقوں میں منتقل ہو چکی ہے جہاں کم سے کم مسلمان ہوں، یا غیر ملکی ہوں۔ یہ تکلیف دہ سچ ہے جس پر کم از کم ہمارے ملک میں بہت کم لکھا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح نیویارک کی مثال سامنے رکھیے۔طالبعلم کی نظر میں امریکہ میں مذہبی اور نسلی تعصب بہت کم تھا۔مگر اب وہاں بھی اسکا تناسب حد درجہ بڑھ چکا ہے۔ہمارے اکثر لوگ نیویارک میں ٹیلو کیب چلاتے ہیں۔جو از حد مشکل کام ہے۔یہ محنت کش لوگ ہمارے لیے قابل فخر ہیں۔اور پیشوں میں بھی کافی لوگ ہیں۔مگر اکثریت،امریکہ میں اپنی اپنی مقامی گوری آبادیوں میں بہت کم فعال نظر آتے ہیں۔مقامی الیکشنوں،تقریبات،میل جول میں بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں۔مہنگی جگہوں پر واقع ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ میں بھی حد درجہ کم دکھائی دیتے ہیں۔مغربی دنیا میں ہمارے رویے اجنبیت پر مبنی ہیں۔جب ہم مقامی لوگوں سے میل جول اتنا کم رکھیں گے،تو انہیں اپنے عظیم مذہب کی پُر امن تعلیمات کے متعلق کیا بتا پائینگے۔یہ سماجی فاصلہ کم ہونے کی بجائے،اب پُر تشدد طریقے سے بڑھ رہا ہے۔گزارش تو یہ ہے کہ مسلمان ممالک کی حکومتوں سے بڑھ کر ہمارے مقامی مسلمان،اسلاموفوبیا کو کافی حد تک کم کر سکتے ہیں۔یہ ایک تہذیبی پل کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔جس سے مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کو بہتر طریقے سے سمجھ پائیں۔مگر ایسا ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا۔دوری کا یہ رویہ،سماجی،لسانی،مذہبی فرق اور اسلاموفوبیا کو مزید بھڑکائیگا۔اگلے چند سالوں میں اسکے ہولناک نتائج سامنے آسکتے ہیں! مگر ہمیں تو کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔بھلا فرنگی معاشرے اور کافروں کے ذہن کو سمجھنے سے ہمارا کیا کام؟

راؤ منظر حیات